غلبۂ مسلم کا قرآنی نسخۂ کیمیا

محمد یٰسین مظہر صدیقی

مدتوں سے مسلم امت کے نکبت و ادبار اور زوال و اضمحلال کا رونا رویا جا رہا ہے۔ حال کے زمانے میں وہ اس تواتر و تسلسل سے رویا جا رہا ہے کہ وہ امتِ مسلمہ کا روایتی ماتم بن گیا ہے۔ حالِ مسلم اور بختِ امت بدلنے کا ایک اصولی نسخہ بھی تجویز کیا جاتا ہے کہ کتاب اللہ کو پھر سے لازم پکڑ لیا جائے، کیونکہ اسی کو چھوڑنے، اس سے دور رہنے اور اس پر عمل نہ کرنے کے سبب مسلمانوں کی یہ درگت بنی ہے۔ کتابِ الٰہی کی طرف رجوع اور اس کے تمسک کی صورتیں بھی کبھی کبھی تجویز کی جاتی ہیں جو خاصی متنوع اور جزوی ہیں۔ یہ تنوع اور جزوی نسخہ قرآن کریم کی جزوی تفہیم پر مبنی ہے۔ اس سے زیادہ اس میں فکری اور نظری الجھن ملتی ہے۔ ہو یہ رہا ہے کہ ہر فرد، ہر مکتبِ فکر، ہر ادارہ، ہر مدرسہ، ہر خانقاہ اور ہر جماعت اپنی لکیر کی فقیر بنی ہوئی ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ، صحابۂ کرام کے تعاملِ خیر اور سلفِ صالحین کے طریقۂ کاملہ کا حوالہ تو سب دیتے ہیں، لیکن اپنی فکر و فہم، اپنی مسلکی و اداری کج کلاہی اور اپنی جماعتی فرقہ واریت و عصبیت کی دھند میں اسے گدلا کر دیتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات کے مجموعی تناظر میں اور صحیح اسوۂ نبوی اور وسیع تر طریقۂ سلف میں نسخہ تجویز کیا جائے۔

امتِ اسلامی کے اس کہنہ مرض اور پیچیدہ بیماری کے لیے ایک طویل المیعاد نسخۂ قرآنی کی ضرورت ہے، اس مختصر مقالے میں ادبار کو اقبال میں اور زوال کو عروج میں اور مغلوبیت کو غلبہ میں بدلنے کے قرآنی نسخۂ کیمیا کے صرف لازمی اجزاء بطور اشارات ہی پیش کیے جاسکتے ہیں اور ان اجزاء پر مشتمل ایک کامل نسخۂ صحت باندھا جاسکتا ہے۔ اس ضمن میں ایک تمہیدی بات ابتداء میں عرض کرنی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ قرآن مجید کی تنزیل کے تیئس سالہ دورانیہ پر نظر رکھی جائے

تو یہ حقیقت اور عیاں ہو جائے گی کہ اس نسخۂ کیمیا کے مختلف اجزاء مختلف احوال میں کارگر ہوئے ہیں۔ ان مختلف احوال کی تعلیماتِ قرآنی کے عملی اطلاق پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنے خیر القرون میں اور صحابہ کرام اور خلفاء عظام نے اپنے اپنے خیر القرون کے ادوار میں ان تعلیمات کا اطلاق کیونکر اور کیسے کیا تھا۔

قرآنِ مجید اور رسولِ اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ سے متعلق یہ حقیقت بھی سب کو معلوم ہے کہ وہ آفاقی، عالمی اور ابدی ہیں اور تا قیامِ قیامت ان ہی دونوں پر عمل کر کے صلاح و فلاح حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس آفاقیت میں جہانِ مسلم کے ساتھ ساتھ جہانیانِ کائنات بھی شامل ہیں اور وہ بھی امتِ محمدی کے اجزاء ہیں۔ صلاح و فلاحِ مسلم کے ساتھ ساتھ خیر و بہبودِ غیر مسلم بھی اسی طرح کتابِ الٰہی اور نبوتِ محمدی کا مقصود و مطلوب ہے۔ لہٰذا امتِ مسلمہ کا فرضِ منصبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی اندرونی خیر و عافیت کے پہلو بہ پہلو غیروں کو دعوتِ صلاح و فلاح دے۔ قرآن مجید نے اپنے فلسفہ وفکر ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے وسیع تر دامن میں ان دونوں کو سمیٹ لیا ہے اور داعی اور مدعو، مخاطِب اور مخاطَب اور مسلم و غیر مسلم سب کے لیے کچھ ضروری اوصاف وواجبات بھی مقرر کر دیے ہیں۔ مسلم و داعی کے کارِ دعوت کے ساتھ غیر مسلم کے لیے تلاشِ حق کا فریضہ بھی عائد کیا ہے جن سے دونوں کو مفر نہیں۔ لیکن امتِ مسلمہ کے لیے دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ مقدم ہے کہ وہ اسی کے لیے برپا کی گئی ہے۔

کتابِ الٰہی کی آفاقیت اور نبوتِ محمدی کی ابدیت کا ایک اور تقاضا خاص امت اسلامی سے وابستہ ہے۔ اسے بعض محققینِ قرآن اور مفکرین اسلام نے تہذیبِ نفس کا بہت معنی خیز نام دیا ہے جو دراصل قرآنی تزکیہ ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کے سہ گانہ فرائض میں تلاوتِ آیات، تعلیمِ کتاب اور تزکیۂ نفس کو اسی ترتیب سے شامل کیا گیا ہے۔ بلا شبہ تہذیبِ نفس اور تزکیہ وتطہیر سے فرد کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ مراد ہے لیکن قرآن مجید صرف انفرادی تزکیہ پر بس نہیں کرتا، افراد کی انفرادی تطہیر و تزکیہ اور تہذیبِ نفس کے ساتھ ساتھ وہ ان مزکّٰی و مطہّر اور مہذّب نفوس پر مشتمل معاشرہ کی تشکیل بھی کرتا ہے۔ اسے معاشرتی تنظیم و وحدت اور سماجی صحت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے اور اس کے اندر تمام دینی اور دنیاوی امور شامل ہیں جس طرح فرد کی تہذیبِ نفس میں دینی و

دنیاوی امور و معاملات شامل ہیں۔ فرد و معاشرہ کے یکے بعد دیگرے دو ارتقائی مراحل اور آتے ہیں جن کی تشکیل و تنظیم اور تہذیب بھی قرآن مجید کو مطلوب ہے: ایک یہ کہ صحت مند افراد کے مہذب معاشرہ کی سیاسی تنظیم و تہذیب ہو اور اس دوسرے اور آخری مرحلے میں یہ مہذب اسلامی ریاست عالمی خیر و فلاح اور انسانی نجات کا کام کرے۔

اولین جزءِ نسخہ: تہذیبِ نفس

اللہ تعالیٰ کی کتابِ حکمت نے فرد کی تہذیبِ نفس کے لیے اپنی بہت سی آیاتِ کریمہ میں مختلف طریقے تجویز کیے ہیں، ان کو فضائلِ اخلاق اور رذائلِ اخلاق کے دوگانہ اور دو پہلو ناموں سے علمائے اسلام نے بہت مفصل بیان کیا ہے۔ قرآن مجید میں ان کا ذکر حکمتِ تصریف کے تحت بار بار اور مختلف مواقع پر آیا ہے کہ تذکیر کا بھی یہی تقاضا ہے۔ ان کو مومنین یا اہلِ ایمان کے اوصافِ حمیدہ اور صفاتِ ستودہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، یہ فضائل اخلاق ہیں اور مثبت چیزیں ہیں۔ ان کے بالمقابل منافقین اور منکرین کے رذائلِ اخلاق کا ذکر ہے یا عام برائیوں اور بری عادات و اطوار کا ذکر ہے جو منفی ہیں۔ فرد مسلم کی تہذیبِ نفس کا واضح اور سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ وہ فضائلِ اخلاق سے آراستہ، صفاتِ اہل ایمان سے پیراستہ ہو اور رذائلِ اخلاق سے مبرا اور صفاتِ اہل نفاق سے معریٰ ہو۔ یہ خالص آدرش اور عین نصب ہے۔

مشکل یہ ہے کہ نفسِ انسانی کو ذاتِ الٰہی نے ''فجور'' اور ''تقویٰ'' دونوں اضداد کا مرکّبِ ازلی و ابدی بنا دیا مگر اسی کے ساتھ رحمتِ الٰہی نے اس کے نفس کو فجور اور تقویٰ کی نہ صرف خبر دی بلکہ اول الذکر کو پامال و زیرِ دام کرنے اور موخر الذکر کو طاقتور اور غالب کرنے کا طریقہ بھی بتا دیا۔ جس نے فجور کو مٹی میں ملا دیا اور نفس کو تقویٰ سے مزکیٰ بنا دیا وہی کامیاب ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسی قرآنی فلسفۂ فجور و تقویٰ کو بہیمیت اور ملکوتیت کی مسلسل آویزش میں بہیمیت پر ملکوتیت کے غلبہ کو بیان کیا ہے۔ ان کا یہ نکتہ بھی عین قرآنی ہے کہ بہیمیت کو بالکل فنا کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ وہ طاقت بھی انسانی نفس کی کارکردگی بلکہ حیات و اقدام کے لیے ضروری ہے۔ بس اسے ملکوتیت کے تحت مغلوب رہ کر حق کا کام کرنا ضروری ہے۔ بعض رذائل کے ذکر

میں اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں اور ملکوتیت کے غلبہ کے مختلف طریقے بھی بیان کیے ہیں۔ صحابہ کرام اور دوسرے سلفِ صالحین کے باب میں یہ حقیقت یاد رکھنے کی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ان کی تہذیب نفس اس طرح کی تھی کہ ان میں تقویٰ غالب، ملکوتیت کارفرما اور فضائلِ اخلاق زیادہ تھے۔ اس کے بالمقابل ان کے فجور پامال و پژمردہ، بہیمیت مغلوب اور رذائلِ اخلاق کمیاب تھے۔ بشریت کے ناطے جب غلط زور لگاتا تو ان کا صحیح اس پر لگام لگا دیتا تھا۔ وہ اپنی غلطی اور خطا جانتے اور پہچانتے ہی اس سے دست بردار اور حق وصواب کے طرف دار ہو جاتے تھے اور ناحق پر نادم وشرمسار بھی ہوتے تھے۔ اسی کو عدالتِ صحابہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا واضح مطلب تھا کہ نبوی تربیت سے سرفراز افراد وطبقات عمداً غلطی پر قائم نہیں رہ سکتے۔

اخلاصِ نیت تمام اعمال وفضائل کی لازمی شرط ہے اس لیے قرآن وحدیث میں اسے اولیت حاصل ہے۔ تہذیبِ نفس کے لیے تو اس شرط کی اور بھی ضرورت ہے۔ اگر نفس کو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے مہذب نہیں بنانا ہے تو وہ بیکار ہے۔ قرآن مجید میں اس کو "مخلصین له الدین" جیسی تعبیرات سے بیان کیا گیا ہے اور حدیث میں "انما الاعمال بالنیات الخ" کی تشریح موجود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حوالے سے اسی خلوصِ نیت اور اخلاصِ دل کے لیے "حنیف" اور "قانت" کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں، اسی پر نہ صرف مدارِ تقویٰ وطہارت ہے بلکہ تہذیبِ نفس کا سارا دارومدار اسی پر ہے، ورنہ فجور کی کسی قسم کو بار مل جاتا ہے۔

فضائلِ اخلاق کی تفصیل سے تمام اہلِ علم اور صاحبانِ دانش واقف ہیں۔ ان کی تذکیر اور یادداشت تازہ کرنے کے لے علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبی کی جلد ششم کے مباحث فضائلِ اخلاق اور ان کے رذائل پر بطور حوالہ بیان کیے جاتے ہیں بلکہ ان ہی کی تلخیصِ خالص درج ذیل ہے: فضائلِ اخلاق تو بہت ہیں لیکن ان میں سے خاص خاص یہ ہیں: دل، زبان اور عمل کی سچائی - صدق، عفت و پاکبازی، شرم وحیا، رحم وعفو و درگذر، حلم و بردباری، رفق و لطف، تواضع وانکسار، خوش کلامی وخندہ جبینی، احسان وایثار، اعتدال ومیانہ روی، خودداری و عزتِ نفس، شجاعت و بہادری، حق گوئی وحق پرستی، دیانت وامانت، عہد و میثاق کی پاسداری، استقامت وصلابت اور خیرِ کل وغیرہ۔ حضرت علامہ نے قرآن وحدیث کی آیات وروایات سے

ان کو مستند و مدلل بنایا ہے (جیسے مومنون: ۱-۱۱، بقرہ: ۲۲، ۲۲: آل عمران: ۱۴، ۲۰؛ معارج: ۲۳-۳۴، احزاب: ۳۵، فرقان: ۶۳-۷۵، رعد: ۲۰-۲۲؛ شوریٰ: ۴ اور متعدد دیگر آیات کریمہ)

دراصل رذائل، فضائل کے سکے کے بدنما رخ ہیں۔ ان سے احتراز و اجتناب کرنا لازمی اور ان سے معریٰ ہونا تہذیب نفس کے لیے ضروری ہے۔ اگرچہ وہ فضائل کی منفی صورتیں ہیں تاہم ان کی موجودگی ہی فضائل کے لیے ہلاکت خیز ہے لہذا تہذیب کے لیے سمِ قاتل ہے۔ قرآن مجید میں ان سے بچنے کی تاکید آئی ہے اور حدیث میں ان کی تفصیل۔ وہ بھی اپنے مثبت پہلوؤں کی طرح بے شمار ہیں۔ ان میں سے اہم ترین ہیں: اخلاصِ نیت کے لازمی شرط کے بالمقابل نیت کا کھوٹ کہ اس کی وجہ سے ہی تمام دوسری بیماریاں آتی ہیں۔ جیسے جھوٹ دل، زبان وعمل کا۔ کذب، بدطینتی اور بدکرداری، بے حیائی اور بے شرمی، سختی اور ظلم وستم، غیظ وغضب، سردمہری اور بے مروتی، تعلّی وتکبر، درشت کلامی اور بدخوئی، بخل اور کنجوسی، تجاوز، اسراف اور افراد و تفریط، ذلتِ نفس ومسکنت، بزدلی ومردہ دلی، بدگوئی و باطل پرستی، خیانت وغداری، غیبت و چغل خوری، مداہنت وخوشامد، خود پسندی وخود غرضی، بہتان تراشی اور دشنام طرازی، وعدہ خلافی اور دورخاپن، بدگمانی وسوءِظن، حرص وطمع اور بے ایمانی، بغض وکینہ اور حسد وغیرہ۔

اعتدال ومیانہ روی کو قرآن مجید میں کبھی قوام (سیدھی گذران بقول شاہ عبدالقادر) سے تعبیر کیا گیا ہے اور کبھی کسی اور لفظ سے۔ دراصل وہ فضائل ورذائل دونوں کی سچی کسوٹی ہے۔ فضائلِ اخلاق میں بھی اس اعتدال کی ضرورت بہت زیادہ پڑتی ہے اور میانہ روی کے فقدان نے ہی رذائل کو مٹاڈالنے کا نظریہ وعمل پیدا کیا ہے۔ وہاں ان شرّی قوتوں کو قابو میں رکھنا ایک کام ہے اور ان سے حق کا کام لینا دوسرا کام ہے۔ بعض رذائل اور شری قوتوں کو پامال وزیر قابو رکھنا ہی تہذیبِ نفس کے لیے ضروری ہے۔ تہذیبِ نفس کے اس دوگانہ نسخہ کے استعمال میں بسا اوقات افراط وتفریط نے بڑے گل کھلائے ہیں اور بہت نقصان پہونچایا ہے۔

فضائلِ اخلاق میں مثلاً سخاوت اور احسان وایثار میں یہ افراط دیکھنے کو ملی کہ سارا مال و اسباب لٹادینا اسلامی آدرش قرار دیا گیا۔ اس سے مال واسباب کے شرِ کلی ہونے کا تصور پیدا ہوا جس نے کسب کو ہی برا قرار دیا۔ رہبانیت، فتوح پر انحصار، خود عملی سے اجتناب اور دوسروں کی

دولت یا مال پر تکیہ کر کے زندگی گذارنے کی امر بیل چڑھی۔ صدق اور سچائی کا معیار دوسروں کی زندگی تلخ کر کے اپنا بھرم اور معیارِ تقویٰ قائم کرنے اور تعلّی و تکبر اور فخر و ناز کا طریقہ بن گیا۔ عفت و پاکبازی اور شرم و حیا میں آدرش قرار پایا کہ شادی بیاہ سے احتراز اور عائلی زندگی سے اجتناب کیا جائے اور اس طرح متاہلانہ زندگی کو تہذیبِ نفس میں حارج اور روحانی ترقی میں مانع قرار دے کر قرآن کے واضح حکم اور سنت کے آسان طریقہ کی خلاف ورزی کی گئی۔ عفو و درگذر اور حلم و نرمی اور رفق ولطف کا مطلب مجرموں اور خطا کاروں کی سرپرستی اور جرم و خطا کی اعانت بنا دیا گیا۔ تواضع و خاکساری میں اتنا نیچے اتر گیا کہ نفس کو مٹا دینے اور ذلت و تذلل کو قبول کر لینے کا ملامتی طریقہ سمجھا گیا۔ شجاعت و بہادری میں جان جوکھم میں ڈال کر جان و مالِ مسلم کے اتلاف کو طغرۂ امتیاز قرار دیا گیا۔ ایسی بے اعتدالیاں بہت ہیں۔

رذائلِ اخلاق یا شری/ بہیمی قوتوں کو قابو میں کر کے ان کو حق و صداقت کے لیے استعمال کرنے کا نسخہ بھی قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ حسد انتہائی بری شے ہے مگر علم و مال خرچ کرنے میں اسی حسد کو اختیار کرنے کی تجویز بھی کی گئی ہے۔ (حدیث مسلم: ۱۸۹۴) عصبیت و حمیت جاہلی ہوں تو حرام ہیں لیکن دین وحق کے لیے ہوں تو واجب و پسندیدہ۔ غیظ و غضب بھی اللہ ورسول کے لیے پسندیدہ ہے۔ دراصل تہذیب نفس میں بسا اوقات خود نفس دھوکے دیتا ہے اور اکثر و بیش تر عطائی قسم کے حکماء و اطباء فریب دیتے ہیں۔ اسی بنا پر تہذیبِ نفس میں بھی اعتدال و میانہ روی کی ضرورت ہے۔ بنیادی طور سے اعتدال اور میانہ روی ہی اسلامی دین کی روح ہے، وہ عبادات و معاملات اور دنیا و اخرویات سب میں مطلوب ہے۔ اعتدال ہی سے فطرت اور شخصیت میں حسن بھی آتا ہے اور لوچ بھی۔

امتِ اسلامی کی تشکیل و تعمیر

منفرد اور جدا جدا مہذب نفوس کا وجود پانا قرآن مجید کی تعلیم و تزکیہ کا اولین اور بنیادی مقصد و مرحلہ ہے۔ وہ ان جدا گانہ اجزاء کے تشکیل پانے پر بس نہیں کرتا کیونکہ وہ انتشار و پراگندگی اور بے ربطی کے علائم و معالم ہیں۔ قرآن مجید اجتماعیت و ربط اور ارتباط و امتزاج کو بھی

چاہتا ہے اور وہ تعلیم و تربیت اور تزکیہ قرآنی کا دوسرا مرحلہ ہے۔ متعدد آیاتِ کریمہ میں قرآن مجید نے ایک اسلامی امت کا تصور و خاکہ، نظریہ و فکر اور دائرہ عمل و تشکیل بیان کیا ہے۔ وہ کبھی امت خیر کہلائی ہے اور کبھی امتِ وسط، اسے امۃ واحدہ بھی کہا گیا ہے اور امتِ مسلمہ بھی، وہ امتِ قانت بھی ہے اور امتِ شہادت بھی۔ ان سب میں انبیاء کرام کے حوالے سے اور بنیادی اتفاق کے سبب اسے سب سے زیادہ امۃ واحدہ کہا گیا ہے (بقرہ: ۲۸، ۱۴۳، ۲۱۳؛ آل عمران: ۱۰۴، ۱۱۰، نساء: ۴۱؛ ہود: ۱۸؛ نحل: ۱۲۰؛ انبیاء: ۹۲، مومنون: ۵۲ وغیرہ) اس امت مسلمہ کو خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی پیروی کی پابندی کے حکم کے حوالے سے ملت ابراہیمی بھی کہا گیا ہے (بقرہ: ۱۳۰، ۱۳۵؛ آل عمران: ۹۵؛ نساء: ۱۲۵؛ انعام: ۱۶۱؛ یوسف: ۳۸؛ نحل: ۱۲۳؛ حج: ۷۸ وغیرہ)۔ کلام الٰہی کی دوسری قسم - حدیث و سنت - میں اسی کو ملۃ بیضاء اور ملۃ سمحہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ یہ سارے محض نام اور اسماء مترادفات نہیں ہیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی صفاتِ تشکیلی بھی ہیں اور ان کے تقاضے اور مطالبے بھی۔ اسلامی امت گوناگوں صفات و اوصاف پیدا کرنے کے ساتھ بہت سے حقوق و فرائض ادا کرنے کی پابند بھی بنائی گئی ہے۔ قرآن مجید نے ان صفات و اوصاف اور حقوق و فرائض اور مطالبات و مقتضیات کو بھی ان آیات کریمہ میں اور دوسری آیاتِ مقدسہ میں بیان کیا ہے۔

انفرادی مہذب اجزاء اور جداگانہ تربیت یافتہ نفوس کو ایک دوسرے سے ربط و ارتباط دے کر ایک امتِ اسلامی بنانے کا شاید سب سے مختصر اور موثر ترین اور حکیمانہ نسخہ سورۂ عصر میں بیان کیا گیا ہے جس میں ایمان اور عملِ صالح والوں کو ایک دوسرے کے ساتھ حق کے ساتھ تواصی کرنے اور پھر صبر کے ساتھ تواصی کرنے کا پابند کیا گیا ہے۔ ایمان اور عملِ صالح تہذیبِ نفس کا نتیجہ و ثمرہ ہے اور وہی حق و صبر کے ساتھ ایک دوسرے کے کام آنے اور ان کے ساتھ مربوط ہونے کا داعیہ پیدا کرتا ہے اور انجامِ کار ان کو ایک ''بنیان مرصوص'' (سیسہ پلائی عمارت) کی مانند ایک وحدت میں ڈھال دیتا ہے جس کے تمام اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ ایک کو صدمہ پہونچے تو تمام بے تابی کا شکار ہو جاتے ہیں اور کسی کو راحت و فرحت ملے تو سب خوشی اور مسرت سے جھوم جھوم جاتے ہیں۔ یہی اجتماعیت کا ثمرہ ہے۔

اسلامی اجتماعیت اور امتِ واحدہ کی شخصیت کو نفوس و افراد کے فضائلِ اخلاق بھی بناتے ہیں۔ ان میں سے بیش تر بلکہ ایک معنی میں سب کے سب دو طرفہ تاثیر رکھتے ہیں: ایک طرف وہ نفسِ واحد کی تہذیب کرتے ہیں اور دوسری طرف دوسرے مہذب و تربیت یافتہ نفوس و افراد سے ربط و ارتباط قائم کر کے امتزاج و وحدت پیدا کرتے ہیں۔ صدق و راست بازی، عفت و پاکبازی، سخاوت و جود، دیانت و امانت، رحم و حلم اور عدل و انصاف وغیرہ صرف نفسِ ذات کے لیے نہیں ہیں بلکہ ان میں دوسرے نفوس و افراد کے ساتھ ارتباط و علاقہ قائم کرنے کے معانی و جہات بھی اسی طرح موجود ہیں۔

اسلامی نظامِ حیات اور دستورِ شریعت کی عجب حکیمانہ فطرت ہے کہ اس کے ارکانِ اربعہ نفسِ ذات کی تہذیب سے زیادہ اجتماعیت اور ملی ترکیز کے عناصر رکھتے ہیں۔ نماز و روزہ میں صرف فردِ واحد کی تہذیب شامل نہیں ہے، اقامتِ صلوٰۃ اور ادائے صوم میں دوسرے نفوس کی رعایت کے ساتھ ان کی شمولیت بھی لازمی ہے۔ اسی کو جماعت بھی کہا جاتا ہے۔ ادائے زکوٰۃ و صدقات اور انجام دہیِ حج و عمرہ میں امتِ اسلامی اور ملتِ محمدی کی اجتماعیت و ارتباط کا پہلو زیادہ ظاہر ہے۔ فرائض و واجبات کے ساتھ ساتھ نوافل و مسنونات بلکہ مستحبات کا شمول ملت خیزی کے کام کو پختہ و مستحکم تر کر دیتا ہے کہ وہ مکملاتِ دین ہیں۔

مہذب نفوس اور منفرد اجزاء کو امتِ واحدہ مسلمہ میں ڈھالنے کا عمل رسولِ اکرم ﷺ کے اسوۂ حسنہ میں ملتا ہے۔ مکی دور میں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد ہوتے ہی آپ ﷺ نے تمام قریشی اور مکی مسلمانوں کو مکی مواخاۃ کے ذریعہ امتِ اسلامی بنا دیا۔ دو قریشی مکی خاندانوں کے دو صاحبان قدرِ مشترک کو ایک دوسرے کا دینی، قانونی، شرعی اور اسلامی برادرِ صادق بنا دیا۔ اس کی بنیاد میں وہی تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی صفات و اقدار شامل تھیں جن کو وسیع تر مفہوم میں دین کہا گیا ہے۔ احوال کے مختلف ہوتے ہی مدنی دور میں مواخاۃ مدنی میں ایک مہاجر اور ایک مقامی شخص کو سماجی، معاشی اور دینی و مزاجی قدرِ مشترک پر ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔ حال و وقت کا تقاضا بدلا تو ان کو ایک دوسرے کا وارث بنانے کے بجائے احکامِ وراثت کی بنا پر اقرباء کو وراثت کا حق دار قرار دیا مگر مواخاۃِ مدنی کا بنیادی عنصر نہیں بدلا کہ وہ خالص آفاقی اور غیر مبدل

اقدار و احکام پر استوار تھا۔ اس مواخاۃِ اسلامی کا اتنا دیر پا اثر رہا کہ دونوں بھائی تا عمر ایک دوسرے کے خاص رفیق و دمساز اور عظیم صدیق و محبوب رہے۔ خاص مواخاۃِ باہمی سے وسیع تر مواخاۃِ اسلامی ہے جس کو اسوۂ نبوی اور تعاملِ صحابہ نے عرب موالاۃ کے نظام کے ذریعہ برپا کیا۔

اسلامی ریاست کے قیام کے احکامِ قرآنی

ملی وحدت پیدا کرنے میں جس طرح سماجی ارتباط کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح سیاسی وحدت کی بھی۔ سماجی ارتباط ہی میں سیاسی امتزاج و ارتباط کے بنیادی عناصر پوشیدہ ہوتے ہیں اور ان کو مزید صیقل کر کے سیاسی نظام برپا کیا جاتا ہے۔ اسی کو خلافتِ الٰہی، حکومتِ الٰہیہ، اقامتِ دین اور بعض دوسری اصطلاحات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے اعلاء کلمۃ اللہ، غلبۂ دین، اہلِ ایمان کی سربلندی، حق کی بالادستی اور باطل کی پامالی وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ ان کے اپنے خاص معانی اور مخصوص مفاہیم ہیں اور خاص الخاص جہات و ابعاد بھی، مگر ان سب میں مشترک ہے غلبۂ مسلم اور سرفرازی اسلام۔ دوسرے سیاسی نظاموں کے بالمقابل صرف اسلامی نظامِ سیاست قائم کر دینا ہی قرآن و اسلام کا مقصود نہیں ہے بلکہ اس کو دوسرے تمام سیاسی نظاموں پر غالب و حکمراں کرنا بھی مقصود ہے اور اس کے پیچھے ایک عظیم و شریفانہ ہدف ہے اور وہ ہے تمام انسانوں کی بھلائی کی سبیل کرنا، ان کو ظلم و جبر سے آزاد کرنا اور ان کو انصاف و عدل سے بہرہ ور کرنا کیونکہ تمام دوسرے انسانی سیاسی نظامات بہر حال انسانی فکر و عمل میں استوار ہیں جن میں جبر و ظلم اور استحصال کے عناصر بھی بہر حال ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیاتِ کریمہ میں جس طرح غلبہ مسلم اور غلبہ دین کے احکام ہیں اسی طرح فلاح و بہبودِ انسانی کے لیے امت کے فرائض و واجبات کے احکام بھی ہیں۔ رسول اکرم ﷺ کی رحمت للعالمینی اور امت مسلمہ کی امتِ خیر ہونے کی حقیقت یہی ہے کہ وہ سب کے خیر اور عالمی بہبود کے ربانی نظام پر مبنی ہے جس میں جبر و ظلم اور استحصال کا شائبہ نہیں، صرف عدل ہی نہیں ہے بلکہ رحمت بھی ہے۔

امتِ خیر کی صفات میں خیر کی دعوت دینے اور معروف کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کی صفات اہم ترین ہیں (سورۂ آل عمران: ۱۰۴، ۱۱۰)۔ یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

دراصل جہادِ اسلامی کی روح اور بنیاد و اساس ہے۔ اپنوں کے ساتھ بیگانوں کو اور قریبوں کے ساتھ غیروں کو بھی اچھے کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا امتِ مسلمہ کا فرض ہے۔ اب یہ کام خیر خواہی احوال و حالات کا پابند ہے جس طرح وہ اسلامی حدود و قیود اور قرآنی احکام و فرامین کا پابند ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر خالص زبانی بھی ہوسکتا ہے، ہوتا تھا اور ہونا چاہیے کہ اولین مرحلہ زبانی نصیحت کا ہی ہے۔ دوسرا مرحلہ قوت کے استعمال سے روک دینے اور ہدایت کرنے کا بھی آتا ہے جب تبلیغ و انذار کا زبانی ہتھیار بیکار ہوجائے۔ معروف کے حکم اور منکر کی ممانعت کا دوطرفہ یا دوگانہ حکم و امر قرآنی امتِ اسلامی کی وحدت کو قائم کرنے کا بھی ضامن ہے جس طرح وہ زمین سے شر و فساد دور کرنے اور باطل کو پامال کر کے حق کو غالب کرنے کے لیے ضروری اور لازمی ہے۔

قرآن مجید افراتفری کے مقابلے میں استحکام کو، انتشار کے بالمقابل محکمی کو اور ضعف کی جگہ قوت کو پسند کرتا ہے، کچھ تو اس بنا پر کہ قوت و قدرت اور محکمی و طاقت اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں جن سے اہلِ ایمان کو متصف ہونا چاہیے اور کچھ اس وجہ سے کہ ملت کے استحکام، اجتماعیت کے تسلسل اور معاشرت و سیاست کی مضبوطی اسی سے وابستہ ہے حتیٰ کہ فرد اور افراد کے باب میں بھی ضعف پر قوت کو ترجیح حاصل ہے اور اسی وجہ سے مومنِ قوی کو مومنِ ضعیف پر فضیلت ملتی ہے۔ قوت سے دراصل وہ روح جہاد پیدا ہوتی ہے جو مصائب میں صبر و ثبات اور میدانِ جنگ میں سرفروشی اور سرخوشی پیدا کرتی ہے۔ امن و امان کی صورت اور عام حالات میں اسی سے ثبات و صلابت ملتی ہے جو عالمِ سرخوشی میں بھی شخصیت میں کجی نہیں پیدا ہونے دیتی۔

سورۂ انفال اور سورۂ توبہ میں بالخصوص اور تمام دیگر آیاتِ جہاد و قتال میں بالعموم قوت کی کارفرمائی ملتی ہے۔ ان میں بہت واضح طور سے اہلِ اسلام کو قوت و طاقت، حشمت و وجاہت اور جلال و جبروت اختیار و حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ سورۂ انفال کی آیت کریمہ-۶۰:

''وَأَعِدُّواْ لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدْوَّ اللّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ مِن دُونِهِمْ ج لاَ تَعْلَمُونَهُمُ ج اللّهُ يَعْلَمُهُمْ ط وَمَا تُنفِقُواْ مِن شَيْءٍ فِي سَبِيلِ اللّهِ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لاَ تُظْلَمُونَ '' (اور سرانجام کروان کی لڑائی کو، جو پیدا کر سکو زور اور

گھوڑے پالنے، کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر، اور ایک اور لوگوں پر سوا ان کے جن کو تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور جو خرچ کرو گے اللہ کی راہ میں، پورا ملے گا تم کو، اور تمہارا حق نہ رہے گا۔'' ترجمہ شاہ عبدالقادر دہلویؒ)۔ طاقتِ مسلم اور قوت و حشمتِ ریاست/ امت کا عجیب حکیمانہ نسخہ تجویز کرتی ہے جس کا مطلب بالکل واضح ہے۔ مسلم فرد/ افراد کو اپنی انفرادی حیثیت سے اور مسلم امت و معاشرہ کو سماجی اور اجتماعی طور سے اور اسلامی حکومت و ریاست کو سرکاری سطح پر اپنی اپنی بساط بھر قوت و طاقت ہر حال میں حاصل کرنا لازمی فریضہ ہے۔ اس آیتِ کریمہ کا حکم ہو یا دیگر آیاتِ مقدسہ کا، طاقت کا حصول صرف جنگی حالات اور حربی معاملات تک محدود نہیں ہے۔ وہ عام اصولِ طاقت ہے جو ہر حال میں واجب الحکم اور واجب التعمیل ہے۔ پھر جنگی تیاریاں تو سراسر زمانۂ امن میں ہی کی جاتی ہیں۔ میدانِ جنگ یا قتال برپا ہونے کی صورت میں تو صرف اس جمع شدہ قوت کا اظہار و اخراج ہوتا ہے۔

''حسبِ استطاعت ہر قسم کی قوت'' کا عموم یہ ثابت کرتا ہے کہ اس میں ہر قسم کی طاقت شامل ہے۔ طاقت و قوت کی اقسام بہت ہیں اور وہ معروف و معلوم بھی ہیں، ان میں سے صرف چند کا ذکر تاریخی حوالوں سمیت کیا جاتا ہے۔

علم و فن کی قوت محض آج کے دور کی اہم ترین قوت نہیں ہے، وہ ہمیشہ سے ہر تہذیب میں ایسی ہی رہی ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیاتِ کریمہ اور رسولِ اکرم ﷺ کی بہت سی احادیثِ شریفہ علم و فن کی قوت کے احکام سے بھری ہیں۔ اسی علمی قوت اور فنی طاقت کے حصول کے لیے رسول اکرم ﷺ نے صحابہ کرام کو مکی دور سے مدنی دور تک برابر اور تسلسل سے مختلف علوم و فنون سیکھنے کا حکم دیا، خود ان کا انتظام فرمایا اور معلمین اور مربیوں کو تیار کیا اور مختلف علاقوں میں ان کو بھیجا۔ ان میں قرآن و حدیث اور اسلامی علوم ہی شامل نہ تھے شعر و ادب، صحفِ سماویہ کی تعلیمات اور زبانوں کی قراءت و کتابت، فنونِ حرب کی تحصیل، تکنالوجی کی تربیت اور نہ جانے کتنی دوسری قسم کی علمی و فنی قوتیں شامل تھیں۔ ان ہی کا فیضان تھا کہ عربوں کا جاہلی معاشرہ ایک تعلیم یافتہ، مہذب و مرتب اور منظم اسلامی سماج میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اسی سے اسلامی معاشرہ میں معاشرتی اور سماجی استحکام آیا تھا کہ اس کو سیسہ پلائی ہوئی عمارت بتایا گیا اور اسی نے سیاسی

استحکام و طاقت کی راہ ہموار کر کے اسلامی ریاست و حکومت کی بنیاد مدینہ منورہ میں بعد ہجرت رکھ دی تھی۔

انفرادی، سماجی اور سیاسی استحکام میں حربی قوت اور جنگی طاقت کا کردار بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ غزوۂ بدر کے طاقت آزمائی کے اولین مقابلے میں اسلامی ریاست و معاشرہ کی حربی کمزوری کا احساس سب کو ہی تھا۔ آیتِ کریمہ مذکورہ بالا کا وقتِ نزول اسی معرکۂ طاقت کے معاً بعد کا ہے اور اس حکم پر عمل و اطلاقِ نبوی کا فیصلہ اسی کے بعد کا۔ تاریخی واقعات، قرآنی آیات، سیرتی روایات اور منطقی اشارات سب ثابت کرتے ہیں کہ کہ فوجی قوت کا حصول ایک عظیم مقصد بن گیا تھا اور رسولِ اکرم ﷺ نے افراد و مجاہدین اور سامانِ جنگ بالخصوص شہسواروں کی قوت بڑھانی شروع کر دی اور سات برسوں کی مسلسل اور ان تھک کوشش و محنت سے تین سو تیرہ مجاہدین کی جگہ تیس ہزار مجاہدین اور دو شہسواروں کی جگہ دس ہزار شہسوار دشمنوں کے سامنے اتار دیے تھے اور بقولِ الٰہی دشمنانِ خدا و اسلام کے علاوہ سبھوں کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ حدیث نبوی: ''نصرت بالرعب'' کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ ذاتی جلال و ہیبت کے ساتھ نبوی اور خلیفہ الٰہی کا رعب و داب مل گیا تھا۔ خلافتِ اسلامی کے سو سالہ دور میں اسی فوجی قوت، سیاسی استحکام اور معاشرتی انضباط کے سامنے سارا عالم سرنگوں تھا۔

اس ہمہ جہت قوتِ اسلام کا مقصود و منتہیٰ دوسری قوموں کی مانند زمین ہڑپنا نہیں تھا، نہ ہی دوسروں پر اپنے اقتدار کا جُوا رکھ کر ان کو ظلم و استبداد میں پیسنا اور ان کے مال و دولت پر عیش کرنا تھا۔ تمام آیاتِ جہاد و خلافت میں اس قوتِ اسلامی کا ہدف یہ بتایا گیا کہ فتنہ و فساد مٹ جائے اور پورا پورا دین/حکم صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو جائے: ''وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ كُلُّهُ لِلَّهِ ط'' (سورۂ انفال: ۳۹ نیز البقرہ: ۱۹۳، توبہ-۳۳: ''لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ''، فتح-۲۸، صف: ۹، نصر: ۲ وغیرہ نیز آیات دیگر آیاتِ فتنہ: البقرہ-۱۹۱، ۱۹۳، ۲۱۷، النساء: ۹۱، انفال: ۲۵، ۷۳، توبہ: ۴۷-۴۹، وغیرہ)۔ ان تمام آیاتِ کریمہ میں بالخصوص سورۂ انفال: ۷۳ میں یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ اگر اسلامی معاشرہ و امت اور اسلامی ریاست و حکومت ایسا نہیں کرے گی تو زمین میں فتنہ ہی فتنہ اور فساد کبیر ہوگا: ''اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ

فِتْنَةٌ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ'' اس لیے اسلامی ریاست و امت کے لیے فتنہ کو کچل دینا اور فسادِ کبیر کو روک دینا لازمی فریضہ ٹھہرا۔

نبوی ریاست و معاشرہ نے اپنے زمانے میں جس امنِ عالم کی بحالی، فتنہ کی سرکوبی اور مظلوموں کی ظلم وستم اور جبر و استحصال سے نجات دہی کا بیڑا قرآنی احکام کے آنے کے بعد پوری دلجمعی سے اٹھایا تھا اسی کو خلفاءِ راشدین اور ان کے بعد کے اسلامی خلفاء نے، جن میں صحابہ و تابعین ہی شامل تھے، اپنے ادوار میں جاری رکھا اور دنیا کو اسلامی عدل و انصاف، انسانیت نوازی، قیامِ امن وامان، عالمی خوشحالی اور آفاقی خیر و عافیت کا وہ نمونہ دیا کہ معاصرین ان کے گن گاتے تھے، معاندین اور محکومین ان کے نصرت و اقبال کی دعائیں مانگتے تھے اور مخالفین و مقاتلین ان کی سیاسی قوت کی طہارت، فوجی طاقت کی پاکیزگی، معاشرتی حشمت کی بلندی کے قائل بن گئے تھے اور آج بھی دنیا کی تمام تہذیبیں قوت و طاقت کے ایسے انسانیت پرور اور مظلوم نواز آدرش پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ یہ صرف اس بنا پر تھا کہ فوجی قوت اور سیاسی اور اقتصادی طاقت کو اپنے سطحی مقاصد کے پورا کرنے کے لیے نہیں استعمال کیا گیا تھا بلکہ تمام عالمِ انسانیت کو قرآنی قوت اور نبوی رحمت اور خلافتی شہامت کا نادر تجربہ کرایا گیا تھا۔

رحمتِ عالم اور نجاتِ جہانیان کے احکامِ قرآن

فتنہ و فساد، ظلم و جبر اور استحصال و استبداد سے نجات دلانا اسلامی افراد، معاشروں اور حکومتوں کا لازمی فریضہ بھی ہے۔ اصلاً وہ قوت کے مالک خلیفہ اسلام اور طاقت کی سوت خلافتِ اسلامی کا فریضہ ہے، کہ قوت و طاقت کا حصول اور استعمال ان کے لیے ممکن اور اس کا صحیح اظہار و اطلاق ان کی شرط سے مشروط ہے۔ مگر یہ صرف فوجی اور حربی طاقت کا معاملہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی قوتیں ہیں جن کے ذریعہ افراد اور جماعتیں بھی افراد اور لوگوں کو ظلم وستم اور جبر و استبداد سے بچا سکتی ہیں اور حکومت و سلطنت کے ہاتھوں پر روک لگا سکتی ہیں۔

ان غیر فوجی قوتوں میں سب سے اہم اخلاقی اجتماعی قوت ہے۔ بلاشبہ کبھی کبھی ایک عظیم فرد بھی یا باشوکت افراد بھی الگ الگ اثر انداز ہو سکتے ہیں لیکن اجتماعیت کی قوت سے جو

اخلاقی قوت ابھرتی ہے وہ حکومتوں کے دانت بھی کھٹے کر سکتی ہے۔ اسلامی معاشرہ اور امتِ اسلامی کی اجتماعیت اسی اخلاقی قوت کے حصول کے لیے بھی مطلوب ہے۔ آیاتِ امتِ خیر و امتِ وسط میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس اخلاقی اجتماعی قوت کے مضمر ہونے کی حقیقت بھی موجود ہے۔ محض اچھائی کا حکم دے دینا اور برائی سے روک دینے کی ہدایت کر دینا نہ رسولِ اکرم ﷺ کا منصبِ عالی تھا اور نہ امتِ اسلامی کا مقام بلند ہے، وہ تو صرف اولین مرحلہ ہے، زبان سے، ہاتھ سے، طاقت سے اس کو نافذ کر دینا اصل مقصود ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے بالخصوص اور دوسرے پیغمبروں اور مصلحوں نے بالعموم حکم و ہدایت دینے کے بعد خیر و معروف کے پھیلانے کی اور شر و فساد اور منکر و گناہ کو روک دینے کی کارگر سبیل کی تھی۔ حلف الفضول، قریشی قبائل و افراد سے معاہدوں، دستورِ مدینہ، یہود و نصاریٰ سے امن کے وثائق اور ان سب کے آخر میں غزوات و سرایا کے ذریعہ یہی کارگر سبیل کی گئی تھی۔ شرعی حدود و قوانین کے ذریعہ اندرونی و بیرونی دونوں جگہ فتنہ و فساد کو کچلنے اور حقوق و مراعات کے تحفظ کرنے کی دوسری سبیلیں تھیں۔ قرآن مجید نے اس خاص باب میں انبیاء کرام، مومن افراد اور جماعتِ خیر اور خلفاء ارض کے واقعات بیان کیے ہیں۔ قرآن مجید کا ایک اور اصول اور الٰہی نظام کا ایک اور دستور ہے کہ ایک خاص مدت کی ڈھیل کے بعد ظالموں کو عذابِ الٰہی پکڑ لیتا ہے۔ اس عذابِ آخر سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرنا امتِ اسلامی کا انفرادی، اجتماعی اور سرکاری فریضہ ہے۔

ایمان و اسلام کی دعوت

خیر کی دعوت دینے، اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے باب میں سب سے بڑا کام اسلام کی دعوت دینا ہے کیونکہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے جیسا کہ قرآن نے کہا ہے اور کفر احسان فروشی کا نام ہے اور دونوں ظلم و جبر اور برائی - ہر قسم کی برائی - کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ کارِ نبوت ہے اور انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی امتوں کا بھی یہ فریضہ ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابہ کرام اور ان کے خلفاء عظام نے نہ صرف جزیرۃ العرب بلکہ قرب و جوار کے ممالک سے اس ظلم کو مٹا دیا تھا اور جہاں جہاں اسلامی خلافت کا سایۂ رحمت اور پرچمِ صداقت ضوفگن ہوا وہ

سارے علاقے اور امصار مسلمان ہوگئے اور نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ ان کی زبان عربی -قرآنِ کریم کی زبان- ہوگئی اور ان کی تہذیب وتمدن عربی اسلامی بن گیا۔

اصلاحِ معاشرہ

غیر مسلموں کو اسلام و ایمان کی دعوت کے پہلو بہ پہلو اسلامی معاشرے کی مسلسل اصلاح کی فکر بھی اسی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی خاص تعلیم ہے۔ دوسری بہت سی آیاتِ کریمہ اصلاحِ فرد و معاشرہ کی بات کہتی ہیں۔ باطل کے ان گنت روپ ہیں، وہ بدعات و خرافات، اوہام واباطیل، انحرافات وتجاوزات کے ذریعہ سرنگ بچھاتا ہے۔قرآن مجید نے اسے فتنہ جوئی اور شرطلبی سے تعبیر کرکے حکمتِ زبان و بیان کا ایک نیا اسلوب اور نادر طریقہ ایجاد کیا ہے۔ ان خرابیوں میں وہ انتہائی خطرناک ہیں جو مذہبی تقشّف وتشدد کے ذریعہ معاشرہ یا فرد کی زندگی میں آتی ہیں کہ ان پر تقویٰ کا لبادہ ہوتا ہے یہ بھی کارِ نبوت ہے اور کارِ مسلم وفریضہ امت و منصبِ حکومت بھی۔ ان تینوں سطحوں پر قرآن مجید نے اصلاح کی تجویز مختلف آیات میں بیان کی ہے اور وہ صرف مسلم فرد و معاشرہ تک محدود نہیں ہے۔ تمام انسانی معاشرہ اور افراد کو منکر سے بچانا اہل ایمان وقرآن کا فریضہ ہے۔

ظلم و جبر اور استبداد سے جہاد

اسلامی معاشرہ میں ایسے جہاد کی ذرا کم ضرورت پڑتی ہے لیکن بہر حال پڑتی ہے۔ مرکز گریز افراد وطبقات، بغاوت اور شر وفساد کے علم برداروں اور امن و امان کے دشمنوں اور لٹیروں کے خلاف قوت کا استعمال بھی ضروری ہے۔ قرآن مجید نے اپنی بساط بھر تمام مسلم افراد و طبقات کو اس جہاد میں حصہ لینے پر اکسایا ہے لیکن اسلامی خلافت اور مسلم ریاست کا وہ عظیم ترین جہادِ اصلاح و جدوجہدِ تعمیر ہے۔ فوجی قوت کے استعمال سے شر وفساد کو اکھاڑ پھینکنے کی تعلیم قرآن مجید کی بہت سی آیاتِ کریمہ بالخصوص آیاتِ قتال و جہاد میں دی گئی ہے جن سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔

عالمی جبر واستبداد کی روک تھام کا معاملہ خاصا نازک، پیچیدہ اور ہیجان آفریں ثابت ہوسکتا ہے اور ہے بھی۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کے باہر غیر اسلامی علاقوں اور قوموں میں اگر استحصال اور ظلم و جبر ہو رہا ہو تو مسلمان امت اور اسلامی خلافت خاموش تماشائی بنی رہے گی یا صرف جنبشِ لب اور حرکتِ دہان سے احتجاج کی صدا بلند کرنے پر اکتفا کرے گی۔ یا ان مظلوموں، جبر وستم کے ماروں اور استحصال کے پھندے میں پھنسے انسانوں کو طاقت سے نجات دلائے گی۔ بلاشبہ قرآنِ کریم اور اسلام دونوں بیک زبان صرف ایک جواب دیں گے کہ وہ ہر طرح کی کوشش کر کے اس شر و فساد کو روکے گی اور اگر حالات اور وسائل و ذرائع اجازت دیں گے تو وہ علاقۂ غیر میں اپنے جیسے انسانوں کو بزور ظلم و جبر سے نجات دلائے گی۔ آیاتِ قتال و جہاد میں بالخصوص اور شر و فتنہ دور کرنے سے متعلق احکامِ قرآنی میں بالعموم اس کی وضاحت ملتی ہے۔ سورہ نساء کی آیتِ کریمہ-۷۵ میں اس حکم کی عمدہ ترین نمائندگی ملتی ہے:

''وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاء وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَـذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ وَلِيّاً وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيراً'' (اور تم کو کیا ہے؟ کہ نہ لڑو اللہ کی راہ میں، اور واسطے ان کے جو مغلوب ہیں مرد اور عورتیں اور لڑکے، جو کہتے ہیں: اے رب ہمارے! نکال ہم کو اس بستی سے کہ ظالم ہیں لوگ اس کے، اور پیدا کر ہمارے واسطے اپنے پاس سے کوئی حمایتی، اور پیدا کر ہمارے واسطے اپنے پاس سے مددگار''- شاہ عبدالقادر دہلوی)۔ اسی کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو قتال کرنے پر ابھارا ہے بلکہ اسے ان کا فرض قرار دیا ہے۔ یہ تمام آیاتِ کریمہ عالمی ظلم و استبداد روکنے کو بتاتی ہیں۔

عہدِ نبوی میں غزوۂ خندق تک اسلامی امت و ریاست کی حفاظت کے لیے غزوات و سرایا کیے گئے تھے اور غزوہ خندق کے بعد سے تبوک تک کے بقیہ پانچ سالہ دورِ حیات طیبہ میں اپنوں اور غیروں کے ظلم و جبر کو روکنے کے لیے کئے گئے تھے۔ خلافتِ راشدہ اور خلافت اسلامی کے دوسرے دور میں عراق و شام، ایران و خراسان، مصر و افریقہ اور اسپین و پرتگال وغیرہ کی عالمی فتوحاتِ اسلامی کا مقصد و ہدف مظلوموں اور جبر وستم کے ماروں کو ان کے ظالموں سے

نجات دلانا ہی تھا۔ مفتوحہ ممالک کے واقعات وشواہد اور ان کی اسلامی فتح کے بعد انصاف و عدل اور خیر وفلاح پر مبنی نظام کی برکات اس کی گواہی دیتی ہیں۔

حرفِ آخر

بدقسمتی سے قرآنِ کریم کے حاملین کرام میں سے بیش تر افراد وطبقات کتابِ الٰہی کا جزوی مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی کو قرآن مجید نے اجزاء میں تقسیم کردینے سے تعبیر کیا ہے اور اس کے نتیجے میں قرآنِ کریم کا کلی تناظر سامنے نہیں آتا۔ کچھ افراد وطبقات نے صرف فرد کے نفس کے تزکیہ اور عبادات وریاضات کے ذریعہ اس کی روحانی ترقی کو کلی ہدف قرار دے دیا۔ زیادہ بالغ نظر شخصیات نے امتِ اسلامی یا مسلم امت کے برپا کردینے کی بات کہی اور اسی کو حاصلِ قرآن سمجھ لیا۔ سیاسی پستی اور زوال کے ماحول میں قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والوں نے قرآن مجید کو کتابِ سیاست وحکومت بنا کر رکھ دیا۔ پھر سائنس اور اس کی اقسام، علوم وفنون کے ماہرین کی آراء، اور تصوف ورہبانیت وغیرہ نے اپنی اپنی طبع آزمائی کی۔ ان سب مطالعات وتفہیمات کی افادیت سے انکار نہیں تاہم وہ سب کے سب جزوی مطالعات واطلاقات ہی ہیں۔ قرآن مجید نے بجا طور سے ایسے طریقۂ مطالعہ وعمل پر بعض کتاب پر ایمان لانے اور بعض کتاب کا انکار کرنے کی پھبتی کسی ہے: ''أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ'' (البقرہ/۸۵) وہ محض اہل کتاب پر طنز نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق تمام جزوی مطالعہ کرنے والوں اور اجزاءِ قرآن و کتاب پر عمل کرنے والوں پر ہوتا ہے اور قرآن کے حوالے سے تو صرف مسلمانوں پر۔

اس عالمِ اسباب اور جہانِ عناصر میں اللہ تعالیٰ نے ہر فکر وعمل کے سبب کا ایک خاص نتیجہ مقرر کردیا ہے خواہ وہ دین کا معاملہ ہو یا دنیا کا۔ دنیا کے معاملات میں اسباب اور ان کے نتائج بہ آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں لیکن دین کے معاملے میں دین داروں نے ہی ان کو الجھا دیا ہے اس لیے وہ ان کے فریبِ نفس کا سبب بن گئے اور دوسروں کے لیے گمراہی کا۔ نماز وصلوٰۃ اور روزہ وصوم اور صدقہ وزکوٰۃ اور حج وعمرہ اور اسی طرح تمام دوسری عبادات کے ثمرات ونتائج ہیں جو انسان ومعاشرہ کی دنیوی سعادت اور اخروی فلاح کے بھی ضامن ہیں لیکن ایک مومن

شخص، اسلامی جماعت وامت اور مسلم حکومت ریاست کے لیے وہ کافی نہیں ہیں۔ان کے لیے اقامتِ دین کل کے سارے تقاضے اور مطالبے پورے کرنے ضروری ہیں۔ معاشرہ کی تشکیل و تنظیم اور تعمیر وترقی اور اسلامی خلافت والٰہی حکومت کے شرائط و واجبات بھی پورے کرنے ضروری ہیں۔

سارا کارخانۂ قدرت اور تمام احکام وشرائعِ دین مرحلہ وار ارتقاء اور بتدریج نشو ونما کا اصول بتاتے ہیں۔قرآن کریم ان تدریجی ارتقاء کے مراحل ومنازل سے بھرا پڑا ہے اور حدیث و تاریخ کے شواہد اس پر دال ہیں۔اسی طرح اس جہان آب وگل میں ہر شے دوسری شے، ہر فرد دوسرے فرد سے حتی کہ ایک روح دوسری روح سے وابستہ ہے اور پھر ان کا مجموعہ باہمی تفاعل و تعاون اور تعامل کا پابند ہے:"الارواح جنود مجندة" کا یہی مطلب ہے۔قرآن کریم کے الفاظ وتعبیرات میں اسے اسلامی سطح پر امتِ واحدہ،"المسلمون اخوة" وغیرہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور عالمی انسانی سطح پر"کافة للناس" کی معنی خیز تعبیر سے۔رب العالمین اور رحمۃ للعالمین وغیرہ بھی اسی معنی کی ترسیل کرتے ہیں۔ پھر عالمِ انسانیت تو بابا آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کے ناطے ہی آدمی ہے اور اسی آدمی کی فلاح و بہبود قرآن کا مقصود ہے۔

اس لیے فرد کی تہذیبِ نفس بھی مطلوبِ قرآنی ہے اور تمام افراد کی تہذیب نفس بھی مگر وہ صرف اولین مرحلہ ہے۔دوسرا مرحلہ ان مہذب افراد کو ایک متحدہ، منظم، فعال، کارِ خیر کی عامل اور سب کی بھلائی چاہنے والی امت کی تشکیل ہے۔یہ بھی مطلوب قرآنی ہے۔اس ارتقائی مرحلہ کے بعد تیسرا مطلوبِ قرآن مسلم ریاست بلکہ اسلامی خلافت وحکومت کی تعمیر وتشکیل ہے جو اقامتِ دین کے تمام فرائض ادا کرے اور ایک ہمہ گیر فلاحی ریاست و معاشرہ پر مبنی بھی ہو۔ان تین اہداف کے پورے ہونے کے ساتھ ہی چوتھا مطلوب ومقصودِ قرآن مجید تمام عالم انسانیت کی بھلائی کا آتا ہے۔یہ چاروں مراحلِ ارتقاء قرآن مجید کے بیان کردہ بھی ہیں اور اسلامی غلبہ کے ضامن بھی ہیں۔عہد نبوی اور عہد خلافت میں ان کو اسی ترتیب سے وجود میں لایا گیا تھا۔یہ ارتقاء بنیاد سے شروع ہونا چاہیے کہ اولین مراحل طے کیے بغیر آخری منزل نہیں آتی۔قرآن مجید نے اسی کو اعلاء کلمۃ اللہ اور اظہار (غلبہ) دین کل قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو"اعلون" بتایا ہے۔

زوالِ مسلم اور نکبتِ امت کے ماتم گساروں اور اقبالِ مسلم اور غلبۂ مسلم/ امت کے خواہش مندوں کے لیے صرف ایک ہی نسخہ کیمیا قرآن مجید نے بتایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ پورے قرآن کو، کل کتاب کو، سارے صحیفہ کو پڑھیں ۔ مرحلہ واران منزلِ چہار گانہ کو طے کریں اور کل میں صاحب ایمان بنیں جس طرح رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام بنے تھے۔ صرف اسی صورت میں مسلم غلبہ کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے۔ جزوی عمل پر ظاہر ہے صرف جزوی کامیابی ملے گی۔ اسوۂ نبوی اور اسوۂ صحابہ کرام بھی اسی کلی قرآن پر عمل کے سبب کامیاب و بامراد رہا تھا۔ وہ قرآنِ کل کا غلبہ تھا۔

☆☆☆